(غلام گردش)

والدین کے دل تو موم کے ہوتے ہیں!

ناصر محمود اور یاسر محمود دونوں سگے بھائی ہیں۔ پنڈی کے ایک مضافاتی بستی کے رہائشی۔ سفید پوش بلکہ اس سے بھی نچلی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور۔ والد زندہ تھا۔ کم از کم ایک برس پہلے تک۔ ناصر بڑا بھائی تھا۔ اسے احساس ہوا کہ والد ضعیف ہو چکا ہے۔ کسی بھی وقت بلاوا آ سکتا ہے۔ چھوٹا بیٹا یعنی یاسر والد کے کافی نزدیک تھا۔ خدمت کرتا تھا۔ لہذا بوڑھے والد کا چھوٹے بیٹے کی طرف جھکاؤ بہت زیادہ تھا۔ اسکے ذہن میں آیا کہ کہیں والد، محبت کے جوش میں جائیداد برادر خورد کے نام نہ لگا دے۔ اثاثے بھی کیا تھے۔ دو تین ایکڑ بارانی زمین اور ایک نیم پختہ مکان۔ بارش پر منحصر زمین سے چند ہزار روپے سال کے وصول ہوتے تھے۔ وہ بھی ہمیشہ نہیں۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں کونسی فصل اور کونسے پیسے۔ انتہائی معمولی ذرائع آمدن میں زندگی کیا ہوگی۔ اسکا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ ناصر شادی شدہ تھا۔ اس نے اب ہر وقت سوچنا شروع کر دیا کہ کہیں چھوٹا بھائی جائیداد کا مالک نہ بن جائے۔ کہیں والد بڑھاپے میں کوئی ایسی حرکت نہ کر ڈالے جس سے وہ یعنی ناصر پائی پائی کو محتاج ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایک انتہائی ادنیٰ اور المناک فیصلہ کیا۔ شروع شروع میں تو والد کو کہا کہ جائیداد کا بٹوارا کر دے۔ جب اس بوڑھے آدمی نے جواب دیا کہ اپنی زندگی میں جائیداد اولاد کے نام نہیں کریگا۔ اسکی وفات کے بعد شرعی طریقے سے زمین اور گھر اولاد میں تقسیم ہو جائیگا۔ اس نکتہ پر روز باپ بیٹے میں جھگڑا ہونے لگا۔ گھر کا ماحول حد درجہ تلخ ہو گیا۔ ناصر نے ایک منصوبہ بنایا۔ جس میں والد کو زندگی کی قید سے آزاد کرنا شامل تھا۔ رات گئے، اپنے والد کے کمرے میں گیا۔ بوڑھا باپ سو رہا تھا۔ ناصر نے پوری طاقت سے باپ کا گلا دبا دیا۔ ضعیف باپ کیا مضاہمت کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر تڑپا، ایڑیاں رگڑیں اور جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ بیٹے کی تسکین پھر بھی نہ ہو پائی۔ ایک بوری لایا۔ باپ کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ گوشت کو بوری میں بند کیا۔ بستی کے نزدیک ایک نالہ بہتا تھا۔ بوری، جس میں باپ کی لاش کے حصے تھے، خاموشی سے نالہ میں پھینک دیا۔ گھر میں چھوٹے بھائی کو معلوم ہی نہ ہو پایا کہ اسکے سگے بھائی نے اپنے ہی والد کو بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ خیر تلاش شروع کی گئی۔ اس میں ناکامی کے بعد، پولیس کو مطلع کیا گیا۔ پولیس نے چند ہی دنوں میں شبہ کی بنیاد پر ناصر کو گرفتار کر لیا۔ دورانِ تفتیش بیٹا سب کچھ مان گیا۔ نالہ سے بوری بھی برامد ہو گئی۔ باپ کی لاش کے ٹکڑوں کو اہل خانہ نے دفن کر دیا۔ بڑے بیٹے یعنی ناصر محمود کے خلاف بھرپور قانونی کاروائی کی گئی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ بیٹے نے انتہائی سفاکی سے اپنے والد کو معمولی سے تنازعہ پر قتل کر ڈالا۔

اسی نکتے کو آگے بڑھاتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پشاور میں بخشی پُل کے نزدیک ایک بستی ہے۔ غربت سے اَٹی ہوئی ہمارے عظیم ملک کی معمولی سی کالونی۔ وہاں کاشف نام کا ایک شخص، بیوی بچوں سمیت اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ والدہ کا نام مجددہ بی بی تھا۔ ساس بہو میں ہر وقت نوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ کاشف کی بیوی اور مجددہ کی لڑائی سے گھر کا ماحول حد درجہ خراب ہو چکا تھا۔ کاشف کبھی اپنی بیوی کو سمجھاتا اور کبھی اپنی والدہ کو۔ مگر وہ ہر وقت کی اس چخ چخ کو نہ کم کر پاتا تھا، نہ گھر میں اسکی کوئی بات سنتا تھا۔ ایک دن اسی طرح ساس بہو کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ کاشف نے الماری سے پستول نکالا اور اپنی والدہ پر فائرنگ کر ڈالی۔ اسکے بعد گھر سے بھاگ گیا۔ ماں

زخمی ہوکرزمین پر گرگئی۔ بوڑھی عورت نے زورزور سے چیخنا شروع کردیا۔ فائرنگ اور چلانے کی آواز سنکر ہمسائے گھر پہنچے تو مجددہ سانس لے رہی تھی۔ اسے پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ مگر خاتون زخموں کی تاب نہ لاسکی۔ اور ایمبولینس ہی میں دم توڑ گئی۔ کاشف کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اور اب قانونی معاملے پورے کیے جارہے ہیں۔ اس سے آگے لکھتے ہوئے میرا قلم لرزرہا ہے۔ ہمت ہی نہیں کہ اسطرح کے اَن گنت واقعات قلم بند کرپاؤں۔

اخبار میں والدین کی اولاد کے ہاتھوں مارے جانے کی خبریں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ معمول سے جھگڑے، جائیداد کی تقسیم اور خاندانی تنازعوں میں اولاد کے ہاتھوں ماں باپ مارے جانے کے واقعات اب کوئی راز نہیں ہیں۔ اسطرح کے ادنیٰ واقعات اب اخبار کے اندروالے صفحات میں چھوٹی سی خبر بنتے ہیں۔ اور بس۔ مگر میں جب اسطرح کے واقعات کو کسی جگہ بھی پڑھتا ہوں، تو یقین فرمایئے۔ پورا ذہن سُن ہوجاتا ہے۔ کافی دیر تک جسم میں طاقت نہیں رہتی کہ کرسی سے اُٹھ پاؤں۔ آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ ایسے لگتا ہے کہ ذہن سے سارے خیالات دھواں بنکر غائب ہوگئے ہیں۔ اور میں اندھیرے میں اکیلا کھڑا ہوں۔ ایسی قبیح حرکت۔ اتنا بڑا ظلم۔ اولاد کے ہاتھوں والدین ہی جان دھو بیٹھیں۔ سوچنا تک دشوار ہوجاتا ہے۔ مگر عذاب یہ ہے کہ اسطرح کی خبریں سچی ہوتی ہیں۔ اسطرح کے واقعات اب بڑھتے جارہے ہیں۔ قطعاً عرض نہیں کررہا کہ ماضی میں یہ گھٹیا روش نہیں تھی۔ بالکل تھی۔ خصوصاً اقتدار کی جنگوں میں بھائی، باپ، بیٹے ایک دوسرے پر لشکرکشی کرتے رہتے تھے۔ برصغیر میں کیونکہ اقتدار کی منتقلی کے متعلق ہونے کا کوئی ضابطہ نہیں تھا۔ اسلیے جیسے ہی بادشاہ کمزور ہوتا تھا، بیمار پڑجاتا تھا یا آخری دموں پر ہوتا تھا۔ تو پھر اولاد ایک دوسرے کے خلاف سلطنت حاصل کرنے کیلئے شورش میں مبتلا ہوجاتی تھی۔ برصغیر کی یہی روایت تھی کہ اقتدار کو صرف اور صرف تلوار کے زور پر ہی حاصل کیا جاتا تھا۔ اگر چند صدیوں پہلے کی مغربی دنیا پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی سلطنت حاصل کرنے کیلئے بھائی، بہنیں، بیگمات ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے غور سے دیکھا جائے تو اسلامی ممالک کی اکثریت آج بھی اس منفی روش کا شکار ہے۔ ہمارے جیسے ملک میں بتایا جاتا ہے کہ جمہوریت ہے۔ مگر یہاں بھی غیبی تلوار کی طاقت کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ سازش، قتل وغارت کو تہذیب کا برہنہ لباس پہنا دیا جاتا ہے۔ مگر بنیادی نکتہ وہیں رہتا ہے کہ تخت کیسے حاصل کرنا ہے اور پھر اس پر تسلط کیسے قائم رکھنا ہے۔ سلطنت کے حصول کی جنگ میں خاندانی رقابت کا المیہ سمجھ میں آتا ہے۔ مگر معاشرے میں بالکل معمولی سی باتوں پر والدین اور اہل خانہ کو موت کے گھاٹ اُتار دینا صرف اور صرف ایک سماجی بیماری اور علت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسطرح کی گھٹیا حرکت کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ہمارے عمومی، سماجی رویے کیا تھے۔ ان میں کتنا خوفناک بگاڑ آچکا ہے۔ اس پر ہمارے معاشرے میں کھل کر بات نہیں ہوتی۔ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ معاشرہ اس حد تک گل سڑ چکا ہے کہ اس سے تعفن کے علاوہ کچھ بھی برامد نہیں ہورہا۔ منافقت اتنی زیادہ ہے کہ جو ہم ہیں، اس پر بات کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ جو نہیں ہیں اور نہ بن سکتے ہیں۔ اس پر ہر وقت کج بحثی جاری رہتی ہے۔ تاریخی لوریاں سنا سنا کر ہمیں ایک ایسی ذہنی کیفیت میں مبتلا کردیا گیا ہے کہ ہم ماضی میں سانس لینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتے۔ انتہائی ضعیف روایات کو منطق کا حصہ بنادیا گیا ہے۔ اور ہم اس صورتحال سے اب کسی طور پر باہر نہیں نکل سکتے۔ سچ بولنے اور سچ بتانے والے، سب لوگ معتوب

گردانے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم میں سے اکثریت اپنے حال کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ہمارے پاس دلیل کی عینک ہی موجود نہیں ہے کہ موجودہ سماجی معاملات کی بگاڑ کو دیکھ سکیں۔

روزمرہ کی گفتگو میں کسی سے بھی بات کرکے دیکھیے۔ مرد اور عورت دونوں محنت کرتے نظر آئینگے۔ دفتروں، دکانوں، منڈیوں، بازاروں میں روزمرہ کے کام میں مصروف نظر آئینگے۔ تاجر حضرات روزانہ کثیر تعداد میں پیسے بینکوں میں جمع کرتے مصروف ہونگے۔ کسی بھی طبقہ، امیر یا غریب، ان لوگوں سے پوچھیں کہ آپ اتنی شدید محنت کیوں کررہے ہیں۔ تو اکثریت کا جواب ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ ''اپنے بچوں کے سکھ کیلئے''۔ ''ہماری زندگی جیسی تیسی گزری، مگر اولاد کو بہتر مستقبل دینا چاہتے ہیں''۔ دیکھا جائے تو اس میں آدھا سچ ہوتا ہے۔ انسان اپنی آسائش کیلئے بھی محنت کرتا ہے اور اپنی اولاد کیلئے بھی۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق وہ اولاد کو تعلیم، کاروبار اور تجارت، سب کچھ سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انہیں کوئی اچھی نوکری مل جائے تو مٹھائیاں تقسیم کرتا ہے۔ یہ عمومی رویہ ہے اور اسکی مثالیں ہم میں سے ہر ایک کے اردگرد بکھری ہوئی ہیں۔ انسان اولاد کے سکھ کو متعدد بار اپنے ذاتی آرام سے زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ یہ دین، تہذیب، سماج کے اُصولوں کے عین مطابق ہے۔ مگر پھر ہوتا کیا ہے کہ اولاد خودمختار ہوکر والدین کی شدید ریاضت کو بھولنا شروع کردیتی ہے۔ ماضی کی تکالیف برداشت کرکے انہیں ترقی کے مواقع دینے کو مکمل فراموش کردیتی ہے۔ والدین کی اہمیت روز بروز کم ہونی شروع ہوجاتی ہے۔ وہ بیچارے مکمل اکلاپے کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کمروں میں مقید، انکا مقدر صرف سانس لیتا رہ جاتا ہے۔ اولاد ان پر روک ٹوک بھی روا رکھتی ہے۔ آپکو یہ کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسطرح کے فقرے عام سننے کو ملتے ہیں۔ اب آپکو فیصلے کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اب تو آپ اللہ اللہ کریں۔ نتیجہ یہ کہ بزرگوں کو انکی موت سے پہلے ذہنی طور پر ختم کردیا جاتا ہے۔ ہرگز یہ عرض نہیں کررہا کہ تمام اولاد ایسے ہی کرتی ہے۔ میں نے تو ایسے بلند کردار لوگ بھی دیکھے ہیں جو بوڑھے والدین کی خدمت کرنے کو عبادت گردانتے ہیں۔ مگر انکی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ بے ادبی کا دور دورہ حد درجہ زیادہ ہے۔ اور پھر کچھ رقیق القلب لوگ، اپنے والدین کو قتل تک کرڈالتے ہیں۔ اس سے بھیانک سماجی رویہ اور کیا ہوگا۔ کیا لکھوں۔ کیا عرض کروں۔ سب کچھ لکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اولاد کو سمجھنا چاہیے کہ والدین کے دل تو موم کے بنے ہوتے ہیں۔ انکا غصہ بھی بناوٹی ہوتا ہے۔ دل سے بچوں کیلئے صرف دعائیں نکلتی ہیں۔ ان بے چاروں سے کیا لڑنا!

راؤ منظر حیات